(غلام گردش)

سانپ اور سیڑھی

تھامس جیفرسن اور جون ایڈمز، امریکہ کے وہ سیاسی دیومالائی کردار ہیں۔ انہوں نے درحقیقت جدید امریکہ کی بنیاد رکھی تھی۔ نظریات بھی کافی حد تک ملتے جلتے تھے۔ اہم ترین بات یہ ہے کہ وہ بہترین دوست تھے۔ دوستی ایک تاریخی مرحلہ میں شروع ہوئی۔ امریکہ دراصل، لندن کی ایک کالونی تھی۔ مفتوح اور غلام علاقہ۔ امریکہ میں لندن کے خلاف ایک تحریک چلی جو بنیادی طور پر ایک انقلاب کا آغاز تھا۔ امریکہ میں تین سو سال پہلے ایک کانگریس تشکیل دی گئی جس نے اہم ترین فیصلے کرنے تھے۔ جیفرسن اور ایڈمز، اسی کانٹی نینٹل کانگریس کے نمایاں ترین رکن تھے۔ امریکہ کی آزادی کا مسودہ جسے Declaration of Independence کہا جاتا ہے۔ ان دونوں دوستوں کی مشترکہ محنت کا نتیجہ تھا۔ انکے علاوہ بھی رکن تھے، مگر جس بھرپور طریقے سے ان دوستوں نے آزادی کے مسودہ کو مرتب کرنے میں محنت کی، اسکی مداح پوری کانگریس تھی۔ یہ دونوں اس قدر قریبی دوست تھے، کہ اگر ایک تھوڑا سا دور چلا جاتا، تو دوسرا اسے خط لکھتا رہتا تھا۔ انہوں نے ایک دوسرے کو تین سو اسی خط لکھے جو ذاتی نوعیت کے تھے۔ مگر انکی قریبی دوستی کی سند تھے۔ 1782 میں جب جیفرسن کی بیوی، مارتھا کا انتقال ہوا، تو شدید مایوسی اور ڈپریشن کا شکار ہو گیا۔ یہ ایڈمز ہی تھا، جس نے اسے سہارا دیا اور اسے واپس زندگی کی ڈگر پر رواں دواں کر دیا۔ اگر ایڈمز، دوست ہونے کا حق ادا نہ کرتا، تو شائد جیفرسن دوبارہ کبھی بھی سیاست جیسے سنجیدہ شعبے میں واپس نہ آ سکتا۔ ایڈمز کی اہلیہ ایبی گیل (Abigail) نے لکھا ہے کہ اسکا خاوند یعنی ایڈمز، اگر پورے امریکہ میں کھل کر ہر موضوع پر بات کرتا تھا، تو وہ صرف اور صرف جیفرسن تھا۔ امریکی انقلاب کے بعد جیفرسن کو پیرس میں سفیر بنا کر بھیجا گیا اور ایڈمز، امریکی سفیر بنکر لندن چلا گیا۔ دونوں کی دوستی برقرار رہی۔ انکی فراست اور ذہانت کی مثال دی جاتی تھی۔ سفارت کا دورانیہ مکمل کر کے، دونوں، واپس امریکہ آ گئے۔ پھر سیاست کے میدان میں اپنے جوہر دکھانے لگے۔ مگر سیاست نے انکو دوست کی بجائے بدترین سیاسی حریف بنا دیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ دونوں، ایک طرح کے ذاتی دشمن بن گئے تو بے جا نہ ہوگا۔

1788 میں امریکہ کے نائب صدر بننے کیلئے ان دونوں نے، ایک دوسرے کے خلاف الیکشن لڑا۔ ایڈمز جیت گیا اور وائس پریزیڈنٹ بن گیا۔ مگر انکی دوستی بدترین رقابت میں بدل گئی۔ 1796 میں ان سیاسی حریفوں نے امریکی صدارت کا الیکشن لڑا۔ ایڈمز معمولی فرق سے فتح یاب ہوا اور وائٹ ہاؤس منتقل ہو گیا۔ امریکی صدر تو بن گیا مگر جیفرسن نے اسکی مخالفت ہر جگہ اور ہر موقعہ پر کرنی شروع کر دی۔ جو قانونی ترمیم پیش کی جاتی تھی، جیفرسن اسکی بھرپور مخالفت کرتا تھا۔ Alien and Sedition Act میں تو یہ باہمی تلخی اس قدر بڑھ گئی کہ تمام متحارب دھڑے پریشان ہو گئے۔ انکی صلح کروانے کی کوشش کی گئی جو کامیاب نہ ہو پائی۔ سیاست کے سینے میں دل نہیں ہوتا، یہ تو سب جانتے ہیں۔ مگر طالبعلم کے زاویہ سے سیاست کے دونوں ہاتھوں میں آہنی تلواریں ہوتی ہیں جنکا مقصد، اپنے سیاسی مخالفین کی گردن زنی کرنا ہوتا ہے۔ یہ خواہش ہر معاشرے میں کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ امریکہ میں 1800 دوبارہ الیکشن کا سال تھا۔ پھر دونوں سابقہ دوستوں نے ایک دوسرے کے خلاف چناؤ لڑا۔ اس مرتبہ جیفرسن نے ایڈمز کو ہرا دیا۔ اب وہ امریکہ

کا صدر بن گیا۔ایڈمز نے قصرِ صدارت چھوڑنے سے پہلے ایک انتہائی مشکل حرکت کی۔جو شخص بھی جیفرسن کا سیاسی دشمن تھا،اسے ایڈمز نے اہم ترین عہدوں پر تعینات کر دیا۔صدارت کا عہدہ چھوڑنے سے پہلے،ایڈمز نے تسلی سے،اپنے پرانے دوست کی راہ میں، باہمی دشمنی کی وہ دیوار کھڑی کر دی، جو جیفرسن کو ختم کرتے کرتے کئی سال لگ گئے۔جیفرسن، دوبار امریکہ کا صدر رہا۔اس دوران،ان دونوں سیاسی رہنماؤں میں کسی قسم کی کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔یہ سیاسی رقابت مرتے دم تک قائم رہی۔4 جولائی، 1826 کو جون ایڈمز بسترِ مرگ پر تھا۔مرتے ہوئے آخری الفاظ تھے، کہ ''افسوس میں تو مر رہا ہوں۔مگر تھامس جیفرسن ابھی تک زندہ ہے''۔وہ نہیں جانتا تھا، کہ اسی دن، اسکے مرنے سے ٹھیک پانچ گھنٹے پہلے، تھامس جیفرسن بھی مر چکا ہے۔ان دونوں سیاستدانوں نے مرتے دم تک ایک دوسرے کو معاف نہیں کیا۔دونوں کی دوستی کی مثال دی جاتی تھی۔اسکے بعد، انکی دشمنی بھی ضرب المثل بن گئی۔

آپکے ذہن میں ضرور سوال ہوگا کہ امریکہ میں دو سابقہ دوستوں اور پھر سیاسی حریفوں کی مثال کیوں دے رہا ہوں۔بھلا، امریکی سیاست سے ہمارا کیا تعلق؟ یہ بات بالکل درست ہے کہ امریکی سیاست سے ہمارا کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں۔مگر دوستی اور نفرت کے اس انسانی جذبے سے تو ضرور تعلق ہے، جو ملک کی سیاست میں یکساں اہم ہے۔پاکستان کی سیاسی تاریخ پر نظر ڈالیے۔اس میں ماضی کے دوست، ایک دوسرے کے بدترین حریف نظر آئینگے۔اور ہاں، آج کے حریف، آنے والے وقت میں بہترین سیاسی اتحادی بن سکتے ہیں۔اس ملک نے یہ دلخراش مناظر بار بار دیکھے ہیں۔بغیر کسی تعطل کے اور بغیر کسی اخلاقی جواز کے۔سکندر مرزا 1955 میں پاکستان کے گورنر جنرل تھا۔انتہائی مضبوط گورنر جنرل۔ 1956 میں وہ صدر بن گیا تھا۔اسی دور میں جنرل ایوب کو کابینہ میں وزیر دفاع مقرر کیا گیا تھا۔سکندر مرزا کا خیال تھا کہ جنرل ایوب، اسکے سیاسی دسترخوان کے خوشہ چین ہے۔لہذا کبھی بھی کسی بھی حالت میں اسکے حکم کی خلاف ورزی نہیں کریگا۔سکندر مرزا، ایوب خان کو اپنا قریبی رفیق سمجھتا تھا۔مگر وہ بھول گیا، کہ طاقت کے میدان میں کوئی کسی کا دوست نہیں ہوتا۔سب اپنے اپنے داؤ پر ہوتے ہیں۔ 1958 میں، سکندر مرزا نے جنرل ایوب کے بھرپور تعاون سے، آئین کو منسوخ کر ڈالا۔مگر کیا آپ جاننا چاہینگے کہ ایوب خان کو بطور کمانڈر انچیف دو سال کی توسیع کس نے دی۔یہ صدر سکندر مرزا تھا جو ایوب خان پر اتنا اعتماد کرتا تھا کہ انکو ہر حال میں اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔مگر آئین کی منسوخی کے ٹھیک بیس دن بعد بالکل وہی ہوا، جو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ایوب خان نے سکندر مرزا کو جلاوطن کر دیا اور خود اقتدار پر بھرپور قبضہ کر لیا۔عرض کرنے کا مقصد صرف یہی ہے کہ اقتدار کی بساط میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔یہ ہمیشہ سے جوں کی توں ہے۔صرف مہرے بدلتے رہتے ہیں۔

تلخ حقیقت یہ ہے کہ یہ کھیل آج بھی بھرپور زور و شور مگر مکمل خاموشی کے ساتھ جاری ہے۔پاکستان کی تاریخ سے درجنوں مثالیں دے سکتا ہوں جس میں بہترین رفیق ایک دوسرے کیلئے زہر قاتل بن گئے۔دور مت جایئے۔ایوب خان کو ذوالفقار علی بھٹو پر بے حد اعتبار تھا۔بھٹو، حد درجہ فعال، پڑھے لکھے اور طوفانی انسان تھے۔انکی شخصیت اتنی سحر انگیز تھی کہ ہر کوئی گرویدہ ہو جاتا تھا۔ایوب خان ان میں ایک تھے۔مگر اس اقتدار کی مسند کا جادو دیکھیے کہ ذوالفقار علی بھٹو نے کمال مہارت سے ایوب خان کو چاروں شانے چت کر ڈالا۔ایک دہائی تک سب سے طاقتور صدر، گمنامی کا شکار ہو گیا اور پھر اسی تنہائی میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔گزشتہ دو تین دہائیاں بھی سیاسی طور پر مکمل

ویسی ہی تھیں، جیسے ہمارے ملک کا عمومی مزاج ہے۔ گورنر جیلانی نے نواز شریف کو جنرل ضیاء کے حد درجہ قریب کیا۔ مگر ایک بات عرض کرتا چلوں۔ گورنر جیلانی، جب عہدے سے ہٹ گئے، تو اپنے قریبی دوستوں سے اکثر شکوہ کرتے تھے کہ اب نواز شریف، ان سے کنی کتراتے ہیں۔ اکثر انکے فون کا جواب نہیں دیتے۔ اگر وہ کوئی کام کہہ دیں، تو بالکل نہیں کرتے۔ اس وقت نواز شریف، وزیر اعلیٰ پنجاب تھے اور ضیاء الحق کے حد درجہ قریب تھے۔ گورنر جیلانی بھول گئے تھے کہ اس خطے کی روایات ہمیشہ ایک جیسی ہی رہی ہیں۔ جب کام نکل جائے، تو قافلے کے سارے مسافر ایک دوسرے کیلئے اجنبی ہو جاتے ہیں۔ ایک وقت تو ایسا بھی آیا، جب سابقہ گورنر اکیلے، وہیل چیئر پر گردوں کا ڈائلسز کروانے آتے تھے۔ انکے ساتھ صرف انکا نواسہ ہوتا تھا۔ وہ وہیل چیئر کھینچتا ہوا، شیخ زید ہسپتال کے ڈائسلز وارڈ میں لیجاتا تھا۔ جہاں سابقہ گورنر، خاموشی سے ڈائسلز کرواتے ہیں۔ پھر تن تنہا، واپس چلے جاتے تھے۔ ان سے دعا سلام لینے والا کوئی نہ ہوتا تھا۔ یہ اس مٹی کی سرشست ہے۔ لیکن نہیں، یہ اقتدار کے کھیل کا اُصول ہے۔ اگر آپکی ضرورت نہیں، تو آپکی حیثیت کاغذ کے گھوڑے سے بھی کم ہے۔

تھوڑا سا آگے آیئے۔ ذہن پر زور ڈالیے۔ نواز شریف چند برس تو ضیاء الحق کی برسی پر بڑی گرمجوشی سے تقریر فرمایا کرتے تھے کہ ضیاء الحق کے مشن کو پورا کرینگے مگر پھر یکسر خاموشی اختیار کر گئے۔ اور تو اور جب ضیاء الحق کے بعد، انکے اہل خانہ کو آرمی ہاؤس خالی کرنا پڑا تو چوہدری شجاعت نے اپنا گھر اس خاندان کو پیش کیا۔ نواز شریف اقتدار میں تھے۔ مگر چونکہ، اب انہیں، طاقت کے کھیل میں کسی ماضی کے ضیاء الحق کی ضرورت نہیں تھی۔ لہذا وہ بھی سابقہ شاہی خاندان کی مدد کیلئے تیار نہیں تھے۔ یہ ہے۔ صاحب ہماری سیاست، اور ہمارے سیاسی اُصول۔ اب میں حالیہ دور کی طرف آتا ہوں۔ شوکت خانم ہسپتال کی زمین، بطور وزیر اعلیٰ، نواز شریف نے بہت کم نرخ پر دی تھی۔ کیا آپ نے آج تک، اسکا ذکر موجودہ حکومت کے کسی اہم آدمی کی زبان سے سنا ہے۔ شائد آپکو خبر ہو، کہ عمران خان اور نواز شریف، ماضی کے بہترین دوست تھے۔ دونوں باغِ جناح میں اکٹھے جوگنگ کرتے تھے۔ 1983 کی عرض کر رہا ہوں۔ آج کیا حالات ہیں۔ اس پر بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ سب کو معلوم ہے۔ ایڈمز اور جیفرسن کی سیاسی رقابت تو خیر اتنی تباہ کن نہیں تھی، جتنی سیاسی نفرتیں پاکستان میں ہیں۔ یہاں، اقتدار، سانپ اور سیڑھی کا کھیل ہے۔ اس میں، کس وقت سانپ، سیڑھی کا روپ اختیار کر لے، کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں، کئی بار سانپ بغیر بتائے ڈس بھی لیتا ہے! انتظار کیجئے!

راؤ منظر حیات